راہ معرفت (3)

راہِ معرفت

- تقویٰ
- آثارِ تقویٰ

المہدیؑ ادارہ تربیت اسلامی
آئی ایس او پاکستان

شہید مطہری اپنی پوری عمر اسلامِ عزیز کے مقدس اہداف کے حصول کی جدوجہد میں مصروف رہے، بے راہ رویوں اور انحرافات کے خلاف جانفشانی سے نبرد آزما ہوئے، شہید مطہری دین اسلام اور اس کے مختلف علوم میں تبحر اور قرآن حکیم کے حقائق و غوامض کی بصیرت و معرفت میں اپنی مثال آپ تھے، شہید مطہری میری عمر کا حاصل تھے۔

امام خمینیؒ

شہید مطہری انقلاب اسلامی کا فکری ستون ہیں اور انقلاب کی کامیابی بلکہ اس کو وجود میں لانے میں شہید مطہری کا بہت بڑا کردار رہا ہے اگر آج بھی آپ اسلام کے ترجمان بننا چاہیں اور دینی معارف کو سمجھنا چاہیں تو لازمی ہے کہ کم از کم ایک بار اُستاد مطہری کے تمام آثار اور کتب کا مطالعہ کریں۔

رہبر معظم سید علی خامنہ ایؑ

المہدیؑ ادارۂ تربیت اسلامی
آئی ایس او پاکستان

راہ معرفت (۳)

۱۔ تقویٰ

اہداف:

۱۔ تقویٰ کا مطلب جاننا

۲۔ تقویٰ کی قدر و قیمت اور اس کا اثر کیا ہے؟

۳۔ تقویٰ اور صحت کا تعلق جاننا

تقویٰ کے لغوی معنی:

تقویٰ کا لفظ ایک کثیر الاستعمال اور مقبول عام دینی اصطلاح ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ اسم اور فعل دونوں صورتوں میں پچاسوں جگہ آیا ہے۔ یہ لفظ تقریباً اتنی ہی بار استعمال ہوا ہے جتنی بار مثلاً ایمان یا عمل کا لفظ، یا جتنی بار صلات اور زکات کا لفظ۔ قرآنِ کریم میں روزہ کی نسبت تقویٰ کا تذکرہ بہت زیادہ ہے۔ نہج البلاغہ میں ایک خطبہ ہے جس کا نام "خطبہ متقین" ہے۔ یہ خطبہ امیر المومنینؑ نے کسی شخص کے جواب میں ارشاد فرمایا تھا جس نے درخواست کی تھی کہ متقی کے اوصاف ایسی وضاحت سے بیان کیے جائیں کہ اس کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے۔ ابتداء میں تو امامؑ نے اس کی درخواست مسترد کر دی اور پھر صرف تین چار جملوں پر اکتفا فرمایا لیکن جب وہ شخص جس کا نام ہمام بن شُریح تھا اور جو بہت ہوشیار اور تیز آدمی تھا کسی طرح مطمئن نہ ہوا اور اصرار ہی کرتا رہا اور اس نے منت سماجت شروع کر دی تو امیر المومنینؑ نے بھی مفصل گفتگو کا آغاز کر دیا۔ آپ نے متقی کی سو سے زیادہ صفات بیان کیں اور اس کی سو سے زائد خصوصیات کا نقشہ کھینچا اور اس کے فکری، اخلاقی اور عملی اوصاف پر بیان ختم ہوا۔ مورخین نے لکھا ہے کہ جیسے ہی امام علیؑ کی گفتگو ختم ہوئی، ہمّام نے ایک چیخ ماری اور وہیں جاں بحق ہو گیا۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تقویٰ کا لفظ عام طور پر رائج دینی اصطلاح ہے اور عام لوگوں کی زبان پر بھی یہ لفظ بار بار آتا ہے۔

اس لفظ کا مادہ وقی ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کی حفاظت، اس کا بچاؤ اور نگہداشت، اتقاء کے معنی ہیں محفوظ رکھنا، لیکن یہ آج تک دیکھنے میں نہیں آیا کہ ہماری زبان میں تقویٰ کا ترجمہ حفاظت، بچاؤ یا نگہداشت کیا گیا ہو۔ جب یہ لفظ اسم کے طور پر استعمال ہوتا ہے تو تقویٰ کا ترجمہ پرہیزگاری اور متقی کا ترجمہ پرہیزگار کیا جاتا ہے۔ مثلاً **ھدی للمتقین** کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ یہ ہدایت ہے پرہیزگاروں کیلئے۔ اگر یہی لفظ بطور فعل استعمال ہوتا ہے تو اگر امر کا صیغہ ہو اور اس کا مفعول بھی مذکور ہو تو اس کا ترجمہ خوف اور ڈر کیا جاتا ہے۔ مثلاً **اتقوا اللّٰہ**، ترجمہ ہوگا ڈرو اللہ سے اور **اتقوا النار** کا ترجمہ ہوگا ڈرو آتش جہنم سے۔

یہ ضرور ہے کہ آج تک کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ تقویٰ کا ترجمہ ڈر اور خوف یا کسی چیز سے پرہیز اور

اجتناب ہے لیکن چونکہ کسی چیز سے خوف کا لازمی نتیجہ ہے اس چیز کا ترک اور اس سے اپنا بچاؤ، اس لیے خوف اور بچاؤ لازم وملزوم ہیں۔ ان باتوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مادہ مجازاً بعض موقعوں پر اجتناب کے معنی میں اور بعض موقعوں پر خوف اور ڈر کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس میں تو کوئی حرج نہیں کہ یہ لفظ مجازاً اجتناب یا خوف کے معنی میں استعمال کیا جائے لیکن ساتھ ہی اس کی کوئی وجہ نہیں اور نہ ہی اس بات کی کوئی دلیل ہے کہ اس لفظ کے مجازی معنی ہی مقصود ہوں یعنی مثلاً ڈر، یا اجتناب۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم یہ کہیں کہ **اتقوا اللّٰہ** کے یہی معنی ہیں کہ اللہ سے ڈرو یا **اتقوا النّار** کے یہی معنی ہیں کہ آتش دوزخ سے ڈرو بلکہ اس قسم کے جملوں کے دراصل یہ معنی ہیں کہ اپنے آپ کو عذاب الٰہی سے محفوظ رکھو، یا خود کو آتش دوزخ سے بچاؤ لہٰذا تقویٰ کا صحیح ترجمہ ہوا اپنی حفاظت یا اپنی حفاظت کرنے والے۔

راغب اصفہانی اپنی کتاب مُفردات القرآن میں کہتے ہیں:

"وقایۃ" کے معنی ہیں کسی چیز کو نقصان دینے والی باتوں سے محفوظ رکھنا اور تقویٰ کا مطلب ہے ان باتوں سے بچنا جن کا خوف ہو۔ یہ تو ہوئی اس کی لفظی تحقیق۔ بعد میں کبھی کبھی خوف کو تقویٰ اور تقویٰ کو خوف کہا جانے لگا جیسا کہ سبب کو مسبب کے معنی میں یا مسبب کو سبب کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے لہٰذا شریعت کی اصطلاح میں تقویٰ کے معنی ہو گئے نفس کو گناہ سے محفوظ رکھنا اور منہیات سے اجتناب کرنا۔

راغب یہ تو تصریح کرتا ہے کہ تقویٰ کے معنی ہیں خود کو محفوظ رکھنا لیکن وہ صراحتاً یہ نہیں کہتا کہ خوف تقویٰ کے مجازی معنی ہیں۔ وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ **اتقوا اللّٰہ** کے مجازی معنی مقصود ہیں۔ جیسا کہ ہم نے ابھی کہا ہے، اس بات کی کوئی دلیل نہیں کہ اس طرح کے جملوں میں تقویٰ کا لفظ مجازی معنوں میں ہی استعمال ہوا ہے۔

یہ بات نسبتاً عجیب معلوم ہوتی ہے کہ فارسی (اور اُردو) میں اس لفظ کا ترجمہ پرہیزگاری کیا گیا ہے۔ اب تک یہ کہیں دیکھنے میں نہیں آیا کہ کسی جگہ اہل لغت نے یہ کہا ہو کہ یہ لفظ اس معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ ابھی ہم نے دیکھا کہ راغب نے یہ تذکرہ تو کیا ہے کہ یہ لفظ خوف کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے لیکن پرہیزگاری کا تو اس نے نام بھی نہیں لیا۔ معلوم نہیں کب سے اور کیوں اس کا ترجمہ پرہیزگاری رواج پا گیا۔ کوئی اہل زبان دورِ قدیم یا دورِ جدید میں اس لفظ کا یہ مفہوم بیان نہیں کرتا۔ اس میں تو شک

نہیں کہ تقویٰ اور کسی چیز سے حفاظت نفس کا لازمی نتیجہ اس چیز کا ترک اور اس سے اجتناب ہے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ تقویٰ کے معنی ہی ترک، پرہیز اور اجتناب کے ہو گئے۔

خوفِ خدا:

چونکہ ضمناً خوفِ خدا کا تذکرہ آ گیا ہے، یہ نقطہ بھی بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ممکن ہے کسی کے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ خوفِ خدا کا کیا مطلب ہے؟ کیا خدا کوئی خوفناک چیز ہے؟ خدا تو کامل واکمل اور اس قابل ہے کہ انسان اس سے محبت کرے اور اسے دوست رکھے۔ پھر خدا سے ڈرنے کے کیا معنی ہیں؟

اس سوال کے جواب میں ہم یہی کہیں گے کہ واقعی ذاتِ خداوندی خوف اور دہشت کا سبب نہیں۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈرنا چاہیے اس کا مطلب یہ ہے کہ عدل الٰہی کے قانون سے ڈرنا چاہیے۔ دعا میں آیا ہے:

یامن لا یرجیٰ الا فضلہ و لا یخاف الا عدلہ

"اے وہ ذات کہ جس کے فضل وکرم ہی سے اُمیدیں وابستہ ہیں اور خوف صرف اس کے عدل کا ہے"

اسی طرح دعا میں یہ بھی آیا ہے:

جللت ان یخاف منک الا العدل و ان یرجیٰ منک الا الاحسان و الفضل

" تو اس سے بالاتر ہے کہ تجھ سے سوائے تیرے عدل کے کسی اور وجہ سے ڈرا جائے اور تجھ سے سوائے تیرے لطف وکرم کے کوئی اور امید رکھی جائے"۔

عدل وانصاف بھی بذاتِ خود کوئی ڈرنے اور خوف کھانے کی چیز نہیں۔ انسان اگر عدل سے ڈرتا ہے تو وہ درحقیقت اپنی ذات یا اپنے اعمال سے ڈرتا ہے کہ مبادا اس نے ماضی میں کوئی غلطی کی ہو یا آئندہ اپنی حدود سے تجاوز کرے اور دوسروں کے حقوق پامال کرے لہٰذا خوف ورجا کے یہ معنی ہیں کہ مومن ہمیشہ پرامید بھی رہے اور خائف بھی، بھلائی کی توقع بھی رکھے اور فکرمند بھی رہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے نفسِ امارہ کی سرکشی سے خوف زدہ رہے کہ کہیں عقل وایمان کی باگ ہاتھ سے نہ چھوٹ جائے اور

ساتھ ہی ذاتِ خداوندی پر بھروسہ بھی رکھے اور یہ آس لگائے کہ اللہ کی مدد ہمیشہ اس کے شامل حال رہے گی۔ حضرت علی بن الحسینؑ "ابوحمزہ ثمالی" میں فرماتے ہیں:

مولای اذا رایت ذنوبی فزعت و اذا رایت کرمک طمعت

"میرے آقا! جب میں اپنی خطائیں دیکھتا ہوں تو مجھ پر خوف و ہراس چھا جاتا ہے لیکن جب تیرے کرم پر نظر پڑتی ہے تو امید بندھ جاتی ہے"۔

یہ وہ نکتہ ہے جسے ہم نے ضروری سمجھا کہ ضمناً بیان کر دیا جائے۔

تقویٰ کی حقیقت اور اس کے معنی:

تقویٰ کے جو لغوی معنی بیان کیے گئے ہیں ان سے کسی حد تک یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے تقویٰ کی حقیقت اور اس کے معنی کیا ہیں لیکن ضروری ہے کہ اسلامی اور مذہبی آثار میں اس کے محلِ استعمال پر ذرا اور نظر ڈالی جائے تا کہ تقویٰ کے معنی پوری طرح واضح ہو جائیں۔ پہلے ہم ایک تمہید بیان کرتے ہیں۔

اگر انسان یہ چاہتا ہے کہ اس کی زندگی کا کوئی اُصول ہو اور وہ اس اُصول پر کاربند رہے تو چاہے اس اُصول کا مآخذ دین و مذہب ہو یا کچھ اور اسے لازماً اپنے لیے ایک خاص روش متعین کرنی ہوگی تا کہ وہ جو کام بھی کرے وہ افراتفری اور بے اُصولی کا شکار نہ ہو جائے۔ ایک متعین روش اختیار کرنے اور خاص مسلک اور عقیدہ اپنانے کا مطلب یہ ہے کہ ان کاموں سے اجتناب کرے جو اس کی وقتی خواہشات سے مطابقت تو رکھتے ہیں لیکن اس کے اُصول اور مقصد کے منافی ہیں۔

اس لیے وسیع تر معنی میں تقویٰ ہر اس فرد کی زندگی کا لازمہ ہے جو یہ چاہتا ہے کہ "انسان" بن کر رہے اور عقل کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرے اور کسی خاص اُصول کا پابند ہو۔

دینی لحاظ سے تقویٰ کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی زندگی میں دینی اُصولوں کو اپنا لے اور جو کام دین کے نقطۂ نظر سے غلط اور گناہ ہیں اور ناپاک اور برے سمجھے گئے ہیں ان سے بچے اور ان کا مرتکب نہ ہو۔

اب بات یہ ہوئی کہ گناہوں کی آلودگی سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کا نام تقویٰ ہے۔ اس کی ممکنہ شکلیں دو ہیں۔ بالفاظ دیگر یہ ممکن ہے کہ ہم تقویٰ کی دو قسموں میں سے کوئی ایک اختیار کریں۔ پہلی قسم

ضعیف تقویٰ اور دوسری قوی تقویٰ۔

پہلی قسم تو یہ ہے کہ ہم گناہوں کی آلودگی سے اپنے آپ کو محفوظ رکھیں اور ان اسباب سے احتراز کریں جن کی وجہ سے گناہ سرزد ہوتے ہیں اور اپنے آپ کو گناہ کے ماحول سے دور رکھیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص حفظانِ صحت کے اُصولوں پر عمل کرے اور بیماری کے ماحول، جراثیم اور بیماری کے چھوت سے بچنے کی کوشش کرے مثلاً وہاں نہ جائے جہاں ملیریا پھیلا ہوا ہو اور ان لوگوں سے دور رہے جو کسی متعدی بیماری میں مبتلا ہوں۔

دوسری قسم یہ ہے کہ انسان میں ایسی روحانی طاقت پیدا ہو جائے کہ وہ اخلاقی اور روحانی ہر لحاظ سے ہر قسم کے گناہوں سے مامون اور محفوظ ہو جائے۔ اگر بالفرض وہ کسی ایسے ماحول میں بھی پہنچ جائے جہاں معصیت کے سارے اسباب اور وسائل فراہم ہوں تب بھی اس کی روحانی طاقت اس کا دفاع کرے اور وہ گناہوں کی آلودگی سے محفوظ رہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص اپنے جسم میں کسی بیماری کے خلاف ایسی قوت مدافعت پیدا کرے کہ اس بیماری کے جراثیم اس پر اثر انداز نہ ہو سکیں۔

ہمارے زمانے میں تقویٰ کا جو تصور عام طور پر پایا جاتا ہے، وہ یہی پہلی قسم کا تقویٰ ہے۔ اگر کسی شخص کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ متقی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ محتاط ہے، تنہائی پسند ہے اور گناہ آلود ماحول سے دور رہتا ہے۔ یہ تقویٰ کی وہ قسم ہے جسے ہم نے ابھی ضعیف کہا ہے۔

شاید یہ تصور اس لیے پیدا ہوا ہے کہ ہم نے ابتداء ہی سے تقویٰ کا ترجمہ پرہیز گاری کیا ہے۔ رفتہ رفتہ گناہ سے پرہیز کا مطلب ان عوامل اور اس ماحول سے اجتناب ہو گیا جو گناہ پر برانگیختہ کرتے ہیں۔ آہستہ آہستہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ عوام کی نظر میں تقویٰ کے معنی گوشہ نشینی اور سوسائٹی سے دور رہنے کے ہو گئے۔ عام بول چال میں جب یہ لفظ کان میں پڑتا ہے تو علیحدگی پسندی، افسردگی اور پسپائی کی تصویر نگاہوں میں گھوم جاتی ہے۔

اتفاق کی بات ہے کہ خود ہمارے ادب میں خواہ وہ نظم ہو یا نثر ایسی مثالیں موجود ہیں جو تقویٰ کی پہلی صورت کی تصویر کشی کرتی ہیں جو درحقیقت ضعف و کمزوری کی نشانی ہے۔

عملی مجبوری پیدا کرنا:

بعض اخلاقی کتابوں میں کچھ ایسے بزرگوں کا تذکرہ ملتا ہے جو بسیار گوئی سے بچنے کیلئے اور اس خیال سے کہ کہیں کوئی لغو اور بری بات ان کے منہ سے نہ نکل جائے، اپنے منہ میں کنکریاں بھر لیتے تھے ۔ عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ اس قسم کے طرز عمل کو مثالی نمونہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ گناہ سے بچنے کیلئے اس قسم کی مجبوری پیدا کرنا اور پھر گناہ سے بچنا کوئی کمال کی بات نہیں۔ اگر ہم اس قسم کی حرکت کر کے گناہ کے ارتکاب سے اپنے آپ کو محفوظ رکھیں تو گناہ سے تو ضرور بچ گئے مگر ہمارا نفس تو پھر بھی ویسے کا ویسا ہی پاپی رہا، صرف وسائل کی عدم موجودگی کے سبب قدرے مضمحل ہو گیا۔

کمال تو یہ ہے کہ بغیر کسی عملی مجبوری کے اور اسباب و وسائل کی موجودگی کے باوجود معصیت سے پرہیز کیا جائے۔ اگر گناہوں سے اس طرح کے اجتناب کو کمال بھی تصور کیا جائے تب بھی یہ محض تقویٰ کی تمہید اور مشق ہے، خود تقویٰ نہیں۔ اس کی حیثیت زیادہ سے زیادہ تقویٰ کا ملکہ اور استعداد پیدا کرنے کیلئے ابتدائی مرحلہ کی سمجھی جا سکتی ہے کیونکہ تقویٰ کا ملکہ بڑی مشق کے بعد پیدا ہوتا ہے لیکن پھر بھی خود تقویٰ ان باتوں سے مختلف چیز ہے۔ دراصل تقویٰ وہ بلند اور پاک روحانی طاقت ہے جو از خود انسان کی محافظت کرتی ہے اس لیے پوری کوشش اس بات کی کرنی چاہیے کہ تقویٰ کی حقیقی روح پیدا ہو جائے۔

نہج البلاغہ میں تقویٰ کا بیان:

مذہبی روایات خصوصاً نہج البلاغہ میں تقویٰ پر بار بار زور دیا گیا ہے۔ ہر جگہ تقویٰ اس مقدس ملکہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے جو ایسی روحانی طاقت پیدا کرتا ہے جس سے نفس امارہ اور سرکش نفسانی خواہشات خود بخود زیر ہو جاتی ہیں۔

خطبہ نمبر ۱۱۲ میں حضرت امیر المومنینؑ فرماتے ہیں:

"تقویٰ اللہ کے دوستوں کو منہیات سے بچاتا ہے اور ان کے دل میں خوفِ خدا پیدا کرتا ہے یہاں تک کہ وہ صائم النہار اور قائم اللیل بن جاتے ہیں"۔

اس جملہ میں صراحت کے ساتھ تقویٰ اس روحانی طاقت کو کہا گیا ہے جو گناہوں سے محفوظ رکھتی ہے اور خوفِ خدا کو تقویٰ کا ایک ثمرہ بتلایا گیا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ خود تقویٰ کے معنی خوف نہیں بلکہ تقویٰ کا ایک اثر یہ ہے کہ وہ دل میں خوفِ خدا پیدا کرتا ہے جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا اتقوا اللہ کے

یہ معنی نہیں کہ اللہ سے ڈرو۔

نہج البلاغہ کے خطبہ نمبر ۱۲ میں حضرت امیر المومنینؑ فرماتے ہیں:

"میں جو کچھ کہتا ہوں پوری ذمہ داری سے کہتا ہوں اور اس کی صحت کا ضامن ہوں۔ اگر گزشتہ واقعات سے عبرت کسی شخص کیلئے آئندہ واقعات کا آئینہ بن سکے تو تقویٰ اسے مشتبہ کاموں کے ارتکاب سے روکے گا"۔

اسی خطبہ میں آگے چل کر آپؑ فرماتے ہیں:

"یاد رکھو! غلط روی کی مثال ایسے سرکش گھوڑوں کی سی ہے جو لگام کو توڑ کر سوار کو بے بس کر دیں اور بالآخر اسے آتشِ دوزخ میں گرا دیں، اور تقویٰ کی مثال ایسے گھوڑوں کی ہے جو رام ہوں، سوار کے اشارہ پر چلیں اور اسے باغ جنت میں پہنچا دیں"۔

یہاں صراحت کے ساتھ اور ٹھیک ٹھیک تقویٰ کو ایسی روحانی حالت قرار دیا گیا ہے جسے ہم ضبط نفس کی مکمل کیفیت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

ضمناً ایک اور اہم حقیقت بھی بیان کی گئی ہے اور وہ یہ کہ ہوا و ہوس کے تابع فرمان ہونے اور نفسِ سرکش کی باگ ڈھیلی چھوڑ دینے کا نتیجہ بے بسی، کمزوری اور شخصیت کے فقدان کی صورت میں نکلتا ہے۔ ایسی صورت میں آدمی کی حالت اس بے بس سوار کی سی ہو جاتی ہے جو سرکش گھوڑے پر سوار ہوا اور جس کا، نے ہاتھ باگ پر ہے نے پا ہے رکاب میں، اور جو اپنے ارادے سے کچھ نہ کر سکے۔ تقویٰ کا لازمی نتیجہ ضبطِ نفس، قوت ارادی میں اضافہ اور روحانی اور فطری شخصیت کی بلندی کی صورت میں نکلتا ہے۔ ایک متقی شخص کی حالت اس سوار کی سی ہوتی ہے جو سدھائے ہوئے گھوڑے پر سوار ہوا اور اسے اپنی مرضی سے بہ آسانی جدھر ہے لے جائے۔

جو شخص ہوا و ہوس، شہرت طلبی، حرص و لالچ اور جاہ پسندی کے سرکش گھوڑے پر سوار ہو اور ان ہی باتوں کے درپے ہو، زمامِ اختیار اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے وہ ان ہی باتوں کا ہو رہتا ہے اور دیوانہ وار ان کے پیچھے دوڑتا ہے۔ مصلحت بینی اور مال اندیشی سے اسے کوئی واسطہ نہیں رہتا لیکن جو تقویٰ پر بھروسہ کرتا ہے اور اپنے نفس کو قابو میں رکھتا ہے اسے اپنے آپ پر پورا اختیار رہتا ہے اور وہ اپنے نفس کو جدھر چاہے موڑ سکتا اور حرکت دے سکتا ہے۔

نہج البلاغہ کے خطبہ نمبر ۱۸۹ میں فرمایا گیا ہے:

فاان التقویٰ فی الیوم الحرز و الجنّۃ و فی غدِ الطّریق الی الجنۃ

"یعنی انسان کیلئے آج تقویٰ بمنزلہ ایک حصار اور ایک ڈھال کے ہے اور کل جنت کا راستہ ہوگا"۔

حضرت امیر المومنینؑ کے خطبات میں اس طرح کے کلمات بکثرت ہیں مثلاً آپ نے خطبہ نمبر ۱۵۵ میں تقویٰ کو بلند و مستحکم پناہ گاہ سے تعبیر کیا ہے۔

یہ چند مثالیں بطور نمونہ اس لیے بیان کی گئیں کہ اسلامی نقطہ نگاہ سے تقویٰ کی اصلی حقیقت واضح ہوجائے اور یہ معلوم ہوجائے کہ واقعی کون متقی کہلانے کا مستحق ہے۔ اس تقریر سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ دراصل تقویٰ اس روحانی حالت کا نام ہے جو روحِ انسانی کیلئے حصار اور دفاعی ہتھیار کا کام دیتی ہے۔ آدمی کے نفس کو اس کا مطیع و فرمانبردار بناتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ تقویٰ ایک روحانی طاقت ہے۔

تقویٰ اور آزادی:

ہم کہہ چکے ہیں کہ حیوانی زندگی چھوڑ کر انسانی زندگی اختیار کرنے کیلئے ضروری ہے کہ آدمی معین اُصولوں کی پیروی کرے اور اس کیلئے لازمی ہے کہ وہ اپنے آپ کو ان اُصولوں کے مطابق ڈھال لے اور ان سے بال برابر بھی تجاوز نہ کرے۔ اگر وقتی خواہشات اسے اپنی حدود سے تجاوز کرنے پر ابھاریں تو وہ اس سے باز رہے اور باز رہنے کیلئے اسے کچھ چیزیں چھوڑنی پڑتی ہیں۔ اسی کا نام تقویٰ ہے۔ یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ تقویٰ بھی نماز روزہ کی طرح دینداری کے لوازم میں سے ہے۔ تقویٰ تو انسانیت کا خاصہ ہے۔ آدمی اگر یہ چاہتا ہے کہ وہ حیوانوں کی سی جنگلی زندگی گزارنے کی بجائے انسانی زندگی گزارے تو وہ مجبور ہے کہ تقویٰ کی راہ اختیار کرے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آج کل معاشرتی تقویٰ اور سیاسی تقویٰ جیسی اصطلاحیں بھی استعمال ہونے لگی ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ دینی تقویٰ میں کچھ اور ہی بلندی، تقدس اور استحکام ہے۔ حقیقتاً تقویٰ کی بنیاد محض دین پر ہے اور دین ہی کی بنیاد پر مستحکم اور اُصولی تقویٰ وجود میں آتا ہے۔ ایمان باللہ کی مضبوط بنیاد کے علاوہ تقویٰ کیلئے کوئی اور مستحکم اور قابل اعتماد بنیاد موجود ہی نہیں۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:

أَفَمَنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلَى تَقْوَى مِنَ اللهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ أَمْ مَنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ

عَلَى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهِ فِي نَارِ جَهَنَّمَ وَاللهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ۔

" آیا وہ شخص بہتر ہے کہ جس نے اپنی زندگی کو انبیاء و تقویٰ اور رضائے الٰہی پر رکھی یا وہ جس نے اپنی بنیاد کھوکھلی اور غیر مستحکم گڑھ پر اُٹھائی اور وہ اسے لے کر سیدھی جہنم میں جا گری۔ ایسے ظالم لوگوں کو اللہ کبھی سیدھی راہ نہیں دکھاتا"۔ (توبہ۔۱۰۹)

بہرحال تقویٰ چاہے اس کی بنیاد مذہب پر ہو، لازمۂ انسانیت ہے اور اس کا لازمی نتیجہ کچھ چیزوں کا ترک کرنا اور اجتناب برتنا ہے۔ اس بات کے پیش نظر کہ آئمہ اہلبیتؑ نے تقویٰ کو حصار، قلعہ اور اسی طرح کی چیزوں سے تشبیہہ دی ہے ممکن ہے بعض دلدادگان آزادی یہ تصور کریں کہ تقویٰ بھی آزادی کا دشمن اور آدمی کے پاؤں کی زنجیر ہے۔

پابندی یا مدافعت:

لہٰذا اب اس نکتہ کی بھی وضاحت ہوجانی چاہیے کہ تقویٰ پابندی نہیں بلکہ مدافعت ہے اور ان دونوں میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے لیکن اگر اسے پابندی بھی کہا جائے جب بھی یہ پابندی عین مدافعت ہے۔

چند مثالیں عرض کرتا ہوں۔ آدمی گھر تعمیر کرتا ہے، کمرے بناتا ہے، مضبوط دروازے اور کھڑکیاں لگاتا ہے، مکان کے اردگرد دیوار کھینچتا ہے۔ وہ یہ سب کام کیوں کرتا ہے؟ یہی نا کہ سردی کے موسم میں ٹھنڈک اور گرمی کے موسم میں تپش سے بچاؤ ہوسکے، تاکہ وہ اپنی ضرورت کی چیزوں کو اس طرح محفوظ رکھ سکے کہ وہ صرف اس کے ذاتی تصرف میں رہیں لیکن وہ اپنی زندگی کو ایک مخصوص چار دیواری میں محدود کرلیتا ہے۔ اب اس کو کیا کہا جائے گا؟ کیا گھر اور مکان کا وجود انسان پر پابندی اور اس کی آزادی کے منافی ہے یا اس کی مدافعت اور بچاؤ کا ایک طریقہ! یہی حال لباس کا ہے۔ آدمی اپنے پاؤں کو جوتے میں، سر کو ٹوپی میں اور بدن کو مختلف کپڑوں میں محصور کرلیتا ہے تاکہ اپنے جسم کو صاف ستھرا رکھ سکے اور گرمی و سردی سے بچ سکے۔ اب اس کو کیا کہیں گے؟ کیا یہ کہا جائے گا کہ اس نے اپنے جسم کو قید کرلیا ہے؟ کیا اس پر اظہارِ افسوس کرنا چاہیے کہ پاؤں جوتے میں، سر ٹوپی میں اور بدن کپڑوں میں قید ہوگیا؟ کیا انہیں اس قید سے نجات دلانے کی آرزو کرنی چاہیے؟ کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ گھر اور مکان رکھنا کوئی پابندی ہے یا

آزادی کے منافی؟

تقویٰ بھی روح کیلئے ایسا ہی ہے جیسے زندگی بسر کرنے کیلئے گھر اور بدن کیلئے کپڑے۔ اتفاق دیکھیے کہ قرآن مجید میں تقویٰ کو لباس ہی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سورہ اعراف آیت ۲۶ میں بدن کے چند کپڑوں کا نام لے کر اللہ فرماتا ہے:

وَ لِبَاسُ التَّقْوَی ذٰلِکَ خَیْرٌ

یعنی تقویٰ جو روح کا لباس ہے سب سے بہتر ہے

پابندی تو اسے کہا جاتا ہے کہ انسان کو کسی صلاحیت اور کسی مسرت سے محروم کر دیا جائے لیکن وہ چیز جو انسان کا تحفظ کرتی ہو اور اسے خطرات سے بچاتی ہو، اسے پابندی کا نام کیسے دیا جا سکتا ہے؟ وہ تو مدافعت ہے۔ تقویٰ کو مدافعت کہنا، یہ تعبیر بھی امیر المومنینؑ کی ہے۔ امامؑ فرماتے ہیں:

الا فصونوھا و تصوّنوا بھا

یعنی تقویٰ کی حفاظت کرو اور اس کے ذریعہ سے خود اپنا تحفظ کرو

امیر المومنینؑ اس سے بھی بڑھ کر تقویٰ کی تعبیر فرماتے ہیں اور نہ صرف یہ کہ اسے پابندی نہیں سمجھتے بلکہ تقوائے الٰہی کو آزادی کا ایک بڑا ذریعہ گردانتے ہیں۔ نہج البلاغہ کے خطبہ نمبر ۲۲۸ میں آپ فرماتے ہیں:

"تقویٰ راست روی کی کنجی اور آخرت کی پونجی ہے۔ اس سے ہر قسم کی غلامی سے آزادی اور ہر مصیبت سے رستگاری ملتی ہے۔ تقویٰ کے ذریعے سے آدمی اپنا مقصد حاصل کرتا ہے اور دشمن سے چھٹکارا پاتا ہے اور اس کے وسیلے سے اس کی خواہش پوری ہوتی ہے"۔

سب سے بڑھ کر تقویٰ براہ راست انسان کو روحانی اور اخلاقی آزادی بخشتا ہے اور ہوا و ہوس کی غلامی سے نجات دلاتا ہے۔ حرص و ہوس، حسد و شہوت اور غم و غصہ کی زنجیروں سے اس کی گردن کو چھڑاتا ہے۔ معاشرتی غلامی درصل روحانی غلامی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جو شخص دولت اور عزت و مرتبہ کا غلام ہے وہ معاشرتی لحاظ سے بھی آزادانہ زندگی نہیں گزار سکتا لہٰذا یہ کہنا صحیح ہے کہ:

عتق من کل ملکة

اس لیے تقویٰ نہ صرف یہ کہ کسی قسم کی قید یا پابندی نہیں بلکہ عین حریت اور آزادی ہے۔

تقویٰ کی نگہبانی:

ممکن ہے کہ تقویٰ کے بارے میں جو یہ کہا گیا ہے کہ یہ نگہبان اور محافظ ہے، یہ بات بعض لوگوں کیلئے غرور و غفلت کا سبب بن جائے اور وہ یہ سمجھ بیٹھیں کہ متقی شخص معصوم عن الخطا ہے اور یہ سمجھ کر ان خطرات کی طرف دھیان نہ دیں جو تقویٰ کو متزلزل کرتے اور اس کی جڑ کاٹتے ہیں۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ تقویٰ خواہ کتنے ہی اونچے درجے کا ہو اسے بجائے خود خطرہ لاحق رہتا ہے اس لیے آدمی کو چاہیے کہ جہاں وہ تقویٰ کی محافظت اور نگہبانی میں زندگی بسر کرے وہیں خود تقویٰ کی بھی حفاظت کرے۔ اس میں کوئی منطقی مغالطہ نہیں۔ یہ ممکن ہے کہ جو چیز ہماری حفاظت کا ذریعہ ہو ہمارا بھی فرض ہو کہ خود اس چیز کی حفاظت کریں۔ ابھی ہم نے مثال دی ہے کہ کپڑے آدمی کا گرمی، سردی سے بچاؤ کرتے ہیں لیکن انسان کو بھی کپڑوں کی حفاظت کرنی پڑتی ہے۔ حضرت امیر المومنینؑ نے ایک ہی جملہ میں ان دونوں باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے:

الا فصونوھا و تصوّنوا بھا

یعنی تقویٰ کی حفاظت کرو اور اس کے ذریعہ سے خود اپنی حفاظت کرو۔

اس لیے اگر ہم سے یہ پوچھا جائے کہ تقویٰ ہمارا محافظ ہے یا خود ہمیں تقویٰ کی حفاظت کرنی چاہیے تو ہم یہی کہیں گے کہ دونوں باتیں درست ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ اگر یہ پوچھا جائے کہ آیا تقویٰ سے مقامِ قرب الٰہی تک پہنچنے میں مدد لینی چاہیے یا اللہ سے حصولِ تقویٰ میں مدد کی التجا کرنی چاہیے تو ہم کہیں گے دونوں کام ضروری ہیں۔ تقویٰ کے ذریعہ رضائے الٰہی کے حصول کی بھی کوشش کرنی چاہیے اور اللہ سے تقویٰ کی توفیق مزید کی دعا بھی کرنی چاہیے۔ امیر المومنینؑ نے فرمایا ہے:

"اے اللہ کے بندو! میں تمہیں تقویٰ اختیار کرنے کی نصیحت کرتا ہوں کیونکہ تقویٰ تمہارے اوپر اللہ کا حق ہے اور اس کی وجہ سے تمہارا بھی اللہ پر حق بن جاتا ہے۔ تم اللہ سے مدد مانگو کہ وہ تمہیں تقویٰ کی توفیق عطا کرے اور تقویٰ سے اللہ تک پہنچنے میں مدد حاصل کرو"۔

بہر حال چونکہ ایسے خطرات موجود ہیں جو تقویٰ کی بنیاد متزلزل کر سکتے ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ مذہبی

تعلیمات میں گو تقویٰ کو بہت سے گناہوں سے حفاظت کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے لیکن بعض دوسرے گناہوں کی نسبت جن میں کشش بہت قوی ہے مزید احتیاط کا حکم بھی دیا گیا ہے۔

مثلاً مذہبی تعلیمات میں یہ کہیں نہیں کہا گیا ہے کہ چوری، شراب خوری یا ارتکاب قتل کے خطرے کے پیش نظر تنہائی حرام ہے مثلاً اس کی ممانعت نہیں ہے کہ اگر کوئی شخص معاذ اللہ شراب پینی چاہتا ہے تو وہ رات کو گھر میں تنہا نہ رہے کیونکہ وہاں بظاہر کوئی روک ٹوک نہیں ہوگی۔ وہی ایمان اور تقویٰ اس کے محافظ ہونگے۔ اس کے برخلاف جنس کی کشش چونکہ زیادہ قوی ہے اور اس کی خواہش انسانی جبلت میں داخل ہے اس لیے حکم دیا گیا ہے کہ خلوت میں بے عفتی کا اندیشہ ہو تو وہ ممنوع ہے کیونکہ ایسا خطرہ ہے جو تقویٰ کے حصار کو توڑ سکتا ہے اور اس پر غالب آ سکتا ہے۔

تقویٰ کی قدر و قیمت اور اس کا اثر:

ایک اور موضوع تقویٰ کی قدر و قیمت اور اس کے اثرات ہیں۔ تقویٰ کا جو اثر انسان کی اخروی زندگی پر مرتب ہوتا ہے۔ اس سے قطع نظر انسان کی دنیاوی زندگی میں بھی تقویٰ کی بڑی قدر و قیمت ہے۔ امیر المومنینؑ نے اپنی تعلیمات میں تقویٰ کا مطلب بار بار دہرایا ہے اور تقویٰ کی ترغیب دی ہے۔ آپ نے اس کے اثرات بھی بکثرت بیان فرمائے ہیں۔ کہیں کہیں عام انداز میں بڑے عجیب طریقے سے اس کے فوائد کا تذکرہ کیا ہے مثلاً آپؑ نے فرمایا:

عتق من کل ملکة نجاة من کل هلکة

یعنی یہ آزادی ہے ہر قسم کی غلامی سے اور نجات ہے ہر قسم کی مصیبت سے

یا فرمایا:

"تقویٰ تمہارے دلوں کی بیماری کیلئے دوا ہے اور تمہارے جسمانی امراض کیلئے شفا ہے۔

تمہارے سینہ کی خرابی کی اصلاح ہے اور تمہارے نفوس کی پاکیزگی کا ذریعہ ہے"۔

امیر المومنین امام علیؑ تقویٰ کو ہر تکلیف اور ہر مصیبت میں مفید قرار دیتے ہیں اور واقعہ بھی یہی ہے کہ اگر ہم تقویٰ کا صرف منفی پہلو نہ دیکھیں اور تقویٰ کے معنی صرف منہیات سے اجتناب کے نہ سمجھیں بلکہ اسے اسی نقطہ نظر سے دیکھیں جو امامؑ کا ہے تو یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ تقویٰ انسانی زندگی کا ایک اہم

ستون ہے چاہے یہ زندگی انفرادی ہو یا اجتماعی۔ اگر تقویٰ نہ ہو تو زندگی کی بنیاد ہی ہل جائے۔

کسی چیز کی قدر و قیمت کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم یہ دیکھیں کہ آیا کوئی دوسری چیز اس کی جگہ لے سکتی ہے یا نہیں۔ تقویٰ زندگی کی ایک ایسی حقیقت ہے کہ کوئی دوسری چیز اس کی جگہ نہیں لے سکتی۔ نہ طاقت، نہ دولت، نہ قانون، نہ کچھ اور۔

موجودہ دور میں ہم بے شمار معاشرتی مسائل میں گھرے ہوئے ہیں جن کے متعلق لوگوں میں واویلا مچا ہوا ہے۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ طلاق کے واقعات کیوں روز بروز بڑھ رہے ہیں؟ قتل اور چوری کے جرائم میں اضافہ کیوں ہو رہا ہے؟ ملاوٹ اور دھوکہ بازی کیوں عام ہے؟ فحاشی کیوں بڑھ رہی ہے؟

بلاخوفِ تردد یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان خرابیوں کا ایک بڑا سبب ایمان کی کمزوری ہے۔

اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے کہ لوگ خود ہمیشہ یہ سب سوال اُٹھاتے ہیں، ان مسائل پر لکھتے ہیں لیکن چونکہ ایمان اور تقویٰ کے عناصر سے محروم ہیں اس لیے کوشش کرتے ہیں کہ ان مسائل کے اصل اسباب کی طرف لوگوں کو متوجہ نہ ہونے دیں۔ ان میں اخلاقی انتشار پیدا کرتے رہیں اور تقویٰ اور اس سے پیدا ہونے والی قوت مدافعت کی بیخ کنی کرتے رہیں۔ نعوذ باللہ اگر ایمان اور تقویٰ کی حقیقت چھپی رہے تو یہ بھی ممکن ہے کہ کل کچھ لوگ یہ بھی پوچھنے لگیں کہ ہم چوری کیوں نہ کریں، دھوکہ کیوں نہ دیں اور ملاوٹ کیوں نہ کریں وغیرہ وغیرہ۔

تقویٰ اور صحت:

امیر المومنینؑ نے تقویٰ کے بارے میں فرمایا ہے:

شفآء مرض اجسادکم

یعنی تقویٰ تمہاری جسمانی بیماریوں کیلئے شفا ہے۔ شاید آپ یہ سوال کریں کہ تقویٰ تو ایک روحانی معاملہ ہے۔ اس کا صحت سے کیا تعلق؟ یہ صحیح ہے کہ تقویٰ کوئی پاؤڈر یا انجکشن نہیں ہے لیکن اگر تقویٰ نہ ہو تو شفاخانوں کا نظام بھی درست نہیں ہوگا۔ ڈاکٹر بھی صحیح نہیں کام نہیں کریں گے، نرسیں بھی اپنے فرائض کما حقہ انجام نہیں دیں گی، دوا بھی صحیح نہیں ملے گی۔ اگر تقویٰ نہ ہو تو آدمی اپنی صحت بھی برقرار نہیں رکھ سکتا۔ متقی آدمی جو اپنی حدود کے اندر رہتا ہے اور صرف اپنے حق پر قانع اور راضی رہتا ہے اس کی روح

زیادہ مطمئن رہتی ہے۔اس کے اعصاب میں تناؤ نہیں ہوتا اور اس کا دل ٹھیک کام کرتا ہے۔اسے یہ فکر نہیں رہتی کہ کس چیز پر قبضہ کرلے،کیا چیز کھا جائے اور کسے نگل جائے۔ اعصابی بیماریاں اس کے پھیپھڑوں میں زخم نہیں ڈالتیں اور اسے معدہ کے السر میں مبتلا نہیں کرتیں۔شہوت رانی کی زیادتی اسے کمزور نہیں کرتی،عمر اس کی طویل ہوتی ہے،بدن کی سلامتی،روح کی سلامتی اور معاشرہ کی سلامتی،سب کا تقویٰ سے گہرا تعلق ہے۔

دو خاص نکتے اور باقی رہ گئے۔ایک تو یہ کہ تقویٰ روشن ضمیری اور بصیرت عطا کرتا ہے۔اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے۔

إِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا (الانفال:29)

یعنی تقویٰ کا ایک بڑا نتیجہ بصیرت اور بھلے بُرے کی پہچان ہے۔

اس بات کو اس طرح بھی کہا جاسکتا ہے کہ تقویٰ مرحلۂ عرفان میں سیر وسلوک کی راہ ہموار کرتا ہے۔

تقویٰ کا ایک دوسرا اثر یہ ہے کہ تقویٰ مشکلات کو حل کرتا ہے۔قرآن کریم میں سورہ طلاق میں ہے:

وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا (الطلاق:۲)۔

جو تقوائے الٰہی کی دولت سے مالا مال ہے،اللہ اس کیلئے مشکلات میں سے نکلنے کا کوئی راستہ پیدا کر دے گا اور اسے ایسے راستے سے رزق دے گا جس کا اسے گمان بھی نہ ہوگا جو اللہ پر بھروسہ کرتا ہے،اللہ اس کیلئے کافی ہے۔ بے شک اللہ اپنے کام کو پورا کر کے رہتا ہے۔اللہ نے ہر چیز کا ایک حساب مقرر کر رکھا ہے۔

سوالات

سوال۱:تقویٰ کے لغوی معنی کیا ہیں؟

سوال۲:تقویٰ کی حقیقت کیا ہے؟

سوال۳:نہج البلاغہ میں تقویٰ کی وضاحت کیسے کی گئی ہے؟

سوال۴:تقویٰ انسان کی زندگی میں آزادی کیسے لاتا ہے؟

سوال۵:ہمیں تقویٰ کی حفاظت کیسے کرنی چاہیے؟

سوال۶:تقویٰ کی قدر و قیمت کیا ہے؟

سوال۷:تقویٰ کا ہماری صحت پر کیسے اثر ہوتا ہے؟

۲۔آثارتقویٰ

اہداف:

۱۔تقویٰ کی آثار کیا ہیں؟

۲۔تقویٰ مشکلات پر کیسے قابو پاتا ہے؟

۳۔قرآن میں تقویٰ کی وضاحت کیسے کی گئی ہے؟

تقویٰ کے دو خاص اثر:

پچھلے لیکچر میں مَیں نے وعدہ کیا تھا کہ اس دفعہ تقویٰ کے ان دو خاص اثرات کے بارے میں گفتگو ہوگی جن کا قرآن مجید میں ذکر ہے۔ان میں سے ایک روشن ضمیری اور بصیرت ہے جس کے متعلق سورہ انفال کی آیت ۲۹ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا

یعنی اگر تمہیں تقوائے الٰہی حاصل ہوتا تو اللہ تمہارے لیے ایسی کسوٹی بہم پہنچادے گا جس سے تم برے بھلے کی تمیز کرسکو۔

تقویٰ کا دوسرا اثر مشکلات میں آسانی پیدا ہونا ہے۔

سورہ طلاق کی دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا (الطلاق: ۲)

یعنی جسے تقوائے الٰہی حاصل ہوگا اللہ اس کیلئے مشکلات سے نکلنے کی کوئی سبیل پیدا کردے گا۔

وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَهُ مِنْ أَمْرِهِ يُسْرًا (الطلاق: ۴)

یعنی جسے تقوائے الٰہی حاصل ہوگا اللہ اس کے کاموں میں ایک طرح کی آسانی پیدا کردے گا۔

تقویٰ اور روشن ضمیری:

جہاں تک تقویٰ کے پہلے اثر کا تعلق ہے اس کے متعلق قرآن مجید میں یہی ایک آیت نہیں، یہ تو اسلام میں ایک مسلمہ حقیقت ہے اور اس حقیقت کی طرف قرآن کی متعدد آیات میں اشارہ ہے۔احادیث نبوی اور روایات آئمہ اطہارؑ میں بھی یہ مضمون بار بار دہرایا گیا ہے جیسا کہ میں نے پچھلے جسلہ میں عرض کیا تھا یہی وہ مضمون ہے جس سے سلوک وعرفان کی راہ ہموار ہوتی ہے۔اہل عرفان نے تو آیہ کریمہ:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى (بقرہ:282)

سے بھی استدلال کیا ہے۔یہ قرآن شریف کی طویل ترین آیت ہے۔اس کا وہ حصہ جس میں تقویٰ کے اثر کی طرف اشارہ ہے یہ ہے:

وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ يُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ (بقرہ:282)

تقوائے الٰہی اختیار کرو، اللہ تمہیں تعلیم دے گا۔

کہتے ہیں کہ اس آیت میں تقویٰ کے بعد تعلیم کا جو ذکر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ تقویٰ کی صورت میں خاص فیضان الٰہی سے تمہیں تعلیم دی جائے گی۔ حدیث نبوی ہے:

جاهدوا انفسكم علىٰ اهوائكم تحل قلوبكم الحكمة

یعنی ہوا و ہوس کے خلاف جہاد کرو تا کہ حکمت تمہارے دلوں میں جاگزیں ہو جائے۔

ایک اور حدیث نبوی ہے۔ یہ تو مجھے یاد نہیں کہ کسی حدیث کی کتاب میں بعینہٖ یہ جملہ دیکھا ہو لیکن دیگر اسلامی کتابوں میں یہ حدیث خاصی مشہور ہے:

من اخلص لله اربعين صباحاً جرت ينابيع الحكمة من قلبه علىٰ لسانه

جو اللہ کیلئے چالیس روز مخصوص کر دے گا، حکمت کے چشمے اس کے دل سے پھوٹیں گے اور اس کی زبان پر جاری ہو جائیں گے۔

یہی مضمون تغیر لفظی کے ساتھ اُصول کافی، باب الاخلاص میں امام باقرؑ سے منقول ہے:

جو شخص خلوص دل سے چالیس روز تک اللہ پر ایمان رکھے گا یا آپ نے فرمایا: جو شخص چالیس روز تک اللہ کو خوب یاد کرے گا اللہ اسے دنیا میں زہد عطا کرے گا اور اسے ایسی بصیرت دے گا کہ اسے دنیا کی بیماریاں اور ان کی دوائیں نظر آنے لگیں گی۔ حکمت اس کے قلب میں جاگزیں کر دے گا جو اس کی زبان پر جاری ہو جائے گا۔

حضرت علامہ محمد حسین طباطبائی نے اپنی تفسیر "المیزان" میں اہل تسنن کی کتابوں سے ایک حدیث نقل کی ہے کہ جناب رسول اکرمؐ نے فرمایا:

لو لا تكثير فى كلامكم و تمريج فى قلوبكم لرايتم ما آرى و لسمعتم ما اسمع

اگر تم یاوہ گوئی میں مبتلا نہ ہوتے اور لغو خیالات تمہارے دل میں نہ گھسے پھرتے تو تم بھی وہی کچھ دیکھتے جو میں دیکھتا ہوں اور وہی کچھ سنتے جو میں سنتا ہوں۔

اس حدیث میں "تمریج" کا لفظ ہے جس کا مادہ "مرج" ہے۔ اس کے معنی چمن زار اور چراگاہ کے ہیں

جس میں ہر جانور داخل ہو سکتا ہے اور چر سکتا ہے۔ رسول خداؐ فرماتے ہیں کہ تمہارے دل کھلی ہوئی چراگاہ کی مانند ہیں جس میں ہر قسم کے جانور داخل ہو سکتے ہیں۔ ایک اور حدیث میں امام صادقؑ فرماتے ہیں:

اگر شیاطین فرزندانِ آدم کے دلوں کے ارد گرد نہ گھومتے پھرتے تو وہ بھی ملکوتِ سماوی کا مشاہدہ کر سکتے تھے۔

اس قسم کی روایات ہماری دینی کتابوں میں بہت ہیں جن میں تقویٰ اور گناہوں سے پرہیز کو براہِ راست بصیرت اور روشن ضمیری کا وسیلہ قرار دیا گیا ہے اور بالواسطہ طور پر یہی مضمون بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً یہ کہا گیا ہے کہ ہوا پرستی اور ترکِ تقویٰ کا نتیجہ روح کی تاریکی، دل کی تیرگی اور نورِ عقل کا خاتمہ ہے۔

امیر المومنینؑ فرماتے ہیں:

من عَشِقَ شيئًا اعشىٰ بصره و امرض قلبه

کسی چیز کی حد سے بڑھی ہوئی محبت آنکھ کو اندھا اور دل کو بیمار کر دیتی ہے۔

(نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۰۷)

نہج البلاغہ میں آپ کا اور ملفوظہ ہے:

عجب المرء بنفسه احد حسّاد عقله

آدمی کی خود پسندی اس کی عقل کی دشمن ہے۔

آپ ہی کا ایک اور قول ہے:

اكبر مصارع العقول تحت بروق المطامع

عموماً عقل وہاں ماری جاتی ہے جہاں لالچ کی بجلی چمکتی ہے۔

آئیے اب دیکھیں کہ تقویٰ اور بصیرت میں کیا منطقی تعلق ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تقویٰ ایک اخلاقی فضیلت ہے اور اس کا تعلق آدمی کے طرزِ عمل سے ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ انسان کی عقل و فکر اور اس کی قوت فیصلہ پر اثر انداز ہو؟ اور آدمی میں ایسا شعور پیدا ہو جائے جس کا حصول تقویٰ کے بغیر ممکن نہ ہو؟ مجھے احساس ہے کہ بہت سے لوگوں کو اس بات کی صحت پر یقین نہیں آئے گا اور وہ اسے محض تخیل کی پرواز اور شاعری سمجھیں گے۔

مجھے یاد ہے کہ چند سال پہلے میں نے ایک مادہ پرست کی ایک تحریر پڑھی تھی جس میں اس خیال

کا مذاق اڑایا گیا تھا۔اس میں لکھا تھا کہ تقویٰ بھی کوئی ریتی ہے جس سے گھس کر روحِ انسانی کو جلا دی جاسکتی ہے؟

تقویٰ اور عملی سوجھ بوجھ:

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ تقویٰ کے نتیجہ میں جو روشنی اور بھلے برے کی تمیز حاصل ہوتی ہے اصطلاحاً وہ حکمتِ عمل ہے، حکمتِ نظری نہیں۔فلاسفہ کی اصطلاح میں عقل اور سوجھ بوجھ کی دو قسمیں ہیں، ایک عقلِ نظری، دوسری عقلِ عملی۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی کی قوتِ مفکرہ یا فکری استعداد کی دو قسمیں ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ قوتِ مفکرہ سے دو قسم کے افکار پیدا ہوتے ہیں، ایک عملی دوسرے نظری۔

یہ اس کا موقع نہیں ہے کہ ہم اس بارے میں کسی فلسفیانہ بحث میں الجھیں اور عملی افکار اور نظری افکار کا فرق بیان کریں۔اس کام کیلئے تو علیحدہ سے کئی لیکچروں کی ضرورت ہوگی۔اجمالاً اس قدر عرض ہے کہ عقلِ نظری وہ ہے جس پر طبعیات، ریاضیات اور مابعد الطبعیات جیسے علوم کی بنیاد قائم ہے۔ان سب علوم میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ ان میں عقل کو یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ واقعہ کیا ہے؟ فلاں بات اس طرح ہے یا نہیں؟ فلاں چیز فلاں اثر خاصیت رکھتی ہے یا نہیں؟ فلاں خیال صحیح ہے یا نہیں، اس کے برخلاف عقلِ عملی ان علوم کی بنیاد ہے جن کے مطابق زندگی گزاری جاتی ہے اور جو اخلاقی اُصول کی بنیاد ہیں۔ قدماء کے بقول علم اخلاق علمِ تدبیر منزل (ہوم اکنامکس) اور علم سیاست مدن (پولٹیکل سائنس) اسی ضمن میں آتے ہیں۔عقل عملی کی صورت میں یہ فیصلہ کرنا نہیں ہوتا کہ میرا فرض کیا ہے اور مجھے یہ کام کرنا چاہیے یا نہیں۔ مجھے اس طرح کرنا چاہیے یا اس طرح، یہ عقلِ عملی ہی ہے جو خوب و ناخوب، امر و نہی ، چاہیے اور نہیں چاہیے اور اسی طرح کے سوال اٹھاتی ہے۔آدمی جب اپنے لیے طریقہ زندگی کا انتخاب کرتا ہے تو اس کے کام کرنے کے طریقے اور فیصلہ کرنے کے طریقے کا تعلق اس کی عقلِ عملی ہی سے ہوتا ہے، عقلِ نظری سے اس کا براہ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

یہ جو مذہبی تعلیمات میں کہا گیا ہے کہ تقویٰ عقل کو روشن کرتا ہے اور آدمی کی سوجھ بوجھ میں اضافہ کرتا ہے، اس کا تعلق جیسا کہ اندازِ بیان سے ظاہر ہے عقلِ عملی ہی سے ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ تقویٰ کے نتیجہ میں وہ اپنی ضرورتوں کو بہتر طریقے سے پورا کرسکتا ہے اور بہتر طرزِ زندگی دریافت کرسکتا ہے۔اس

بات کا تعلق عقلِ نظری سے نہیں ہے یعنی مطلب یہ نہیں ہے کہ تقویٰ عقلِ نظری پر اثر انداز ہوتا ہے۔اور تقویٰ کے ذریعے سے آدمی ریاضی یا طبعیات کے مسائل بہتر طور پر سمجھنے لگتا ہے اور ان علوم کی مشکلات بہتر طریقے سے حل کرنے لگتا ہے۔خود مابعد الطبعیات کا بھی جہاں تک اس کے منطقی اور استدلالی پہلو کا تعلق ہے یہی حال ہے۔معارف الٰہیہ کی ایک دوسری قسم میں البتہ تقویٰ اور پاکیزگی کا دخل ہے لیکن اس قسم کا بھی فلسفہ، استدلال، منطق اور نتیجہ اخذ کرنے کیلئے ترتیب مقدمات سے کوئی تعلق نہیں۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ تقویٰ سے سوجھ بوجھ بڑھتی ہے اور بصیرت اور روشن ضمیری میں اضافہ ہوتا ہے۔اس بات کا تعلق نظریاتی مسائل اور عقل نظری سے نہیں اور بعض لوگوں کو جو اس بات کو مانتے ہیں مشکل محسوس ہوتی ہے، شاید اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ تقویٰ سے نظریاتی مسائل کو سمجھنا بھی آسان ہوجاتا ہے۔البتہ جہاں تک عقل کا تعلق ہے تو یہ بالکل صحیح ہے کہ تقویٰ، پاکیزگی اور نفسِ امارہ کو زیر کرنے سے بصیرت میں اضافہ ہوتا ہے اور روشن ضمیری کے حصول میں مدد ملتی ہے۔اس بات کیلئے کسی استدلال کی ضرورت نہیں بلکہ تجزیہ خود اس کا گواہ ہے۔تاہم اس کے یہ معنی نہیں کہ عقل بمنزلہ چراغ کے ہے اور تقویٰ تیل کا کام دیتا ہے کہ تقویٰ کے بغیر عقل کام ہی نہ کرے، نہ ہی اس کا مطلب یہ ہے کہ عقل گویا بجلی کا جنریٹر ہے جو بجلی کی ایک خاص مقدار پیدا کرتا ہے اور تقویٰ سے بجلی کی اضافی مقدار پیدا ہونے لگتی ہے۔اس قسم کی کوئی بات نہیں۔ یہاں کچھ اور ہی صورت ہے۔وضاحت کیلئے پہلے ایک تمہید بیان کرتا ہوں۔

دشمنانِ عقل کے دشمن:

امام علیؑ کے ملفوظات میں ہے:

اصدقاءک ثلاثۃ و اعداءک ثلاثۃ

یعنی تیرے تین دوست ہیں اور تین دشمن

فاصدقاؤک: صدیقک و صدیق صدیقک و عدو عدوک

یعنی تیرا ایک دوست تو وہ ہے جو براہ راست تیرا دوست ہے، دوسرا دوست وہ ہے جو تیرے دوست کا دوست ہے اور تیسرا دوست وہ ہے جو تیرے دشمن کا دشمن ہے۔

و اعداؤک: عدوک وعدو صدیقک و صدیق عدوک

یعنی تیرے تین ہی دشمن ہیں، ایک تو وہ جو تیرہ براہ راست دشمن ہو، دوسرا وہ جو تیرے دوست کا دشمن ہواور تیسرا وہ جو تیرے دشمن کا دوست ہو۔

اس کلام کونقل کرنے سے میرا مقصد یہ واضح کرتا ہے کہ دوستوں کی ایک قسم دشمن کا دشمن بھی ہے۔ دشمن کے دشمن کو جو دوست کہا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دشمن کو کمزور کرتا ہے، اس کے ہاتھ باندھ دیتا ہے اور اس طرح آدمی کی مدد کرتا ہے۔ یہ بجائے خود ایک قاعدہ ہے کہ دشمن کا دشمن دوست کی طرح آدمی کی تقویت کا باعث ہوتا ہے۔

یہ قاعدہ جس طرح انسان پر چسپاں ہوتا ہے، اسی طرح انسان کے حالات اور اس کی اخلاقی و روحانی طاقتوں پر بھی چسپاں ہوتا ہے۔ انسان کی اندرونی طاقتیں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی ہیں اور بعض صورتوں میں ایک طاقت دوسری پر منفی اثر ڈالتی ہے اور اسے بیکار کر دیتی ہے۔ یہ ایسا قاعدہ ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا اعتراف قدیم وجدید سب ہی عالموں نے کیا ہے اور یہ خود اپنی جگہ ایک وسیع مضمون ہے۔

روشن ضمیری میں تقویٰ کے اثر کا راز:

کچھ حالات اور کچھ قوتیں ایسی ہیں جو انسان کی عقلِ عملی یعنی اس کے طرزِ فکر اور طرزِ عمل پر اثر انداز ہوتی ہیں اور ان سے متاثر ہو کر آدمی یہ طے کرتا ہے کہ کیا اچھا ہے اور کیا برا، کیا صحیح ہے اور کیا غلط، کیا ضروری ہے اور کیا غیر ضروری، اسے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ اس قسم کی منفی قوتوں میں نفس پرستی، لالچ، ضد، تعصب وغیرہ شامل ہیں کیونکہ انسان کے طرزِ عمل کا اس کے احساسات، اس کی خواہشات اور اس کے جذبات سے گہرا تعلق ہے۔ اگر یہ قوتیں حدِ اعتدال سے گزر جائیں اور انسان ان پر حاکم ہونے کی بجائے ان کا محکوم ہو جائے تو پھر وہ عقل اور ضمیر کی آواز کو دبا دیتی ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پھر آدمی ان کے شور وغل اور ضمیر کی آواز نہیں سن سکتا۔ عقل کے چراغ پر دھند چھا جاتی ہے۔ دیکھیے اس وقت ہم یہاں بیٹھے ہوئے کہہ بھی رہے ہیں، سن بھی رہے ہیں اور دیکھ بھی رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ایک آدمی بات کر رہا ہے، دوسرے خاموشی سے سن رہے ہیں۔ چراغ روشن ہیں، فضا بھی صاف و

شفاف ہے لیکن اگر اسی فضا میں بیک وقت سبھی بولنا اور بلند آواز سے کچھ پڑھنا شروع کر دیں تو ظاہر ہے کہ بولنے والے کو خود اپنی آواز بھی صاف سنائی نہیں دے گی۔ اگر فضا میں گرد وغبار کے بادل چھا جائیں تو کوئی کسی کو نہیں دیکھ سکے گا۔

ہم ایک جوان طالب علم کی مثال لیتے ہیں۔ یہ نوجوان اپنے مدرسہ سے واپس آکر سوچتا ہے کہ اپنے اسباق کی تیاری کرے اور اس مقصد کیلئے چند گھنٹے بیٹھ کر پڑھے لکھے، سوچے سمجھے کیونکہ ظاہر ہے بیکاری اور سستی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ امتحان میں فیل ہو جائے گا، جاہل اور پسماندہ رہ جائے گا اور ہزار خرابیاں پیدا ہونگی۔ یہ تو ہے اس کی عقل کی آواز، مگر یہ ممکن ہے کہ اس آواز کے مقابل میں سیر وتفریح کا شوق یا آنکھیں لڑانے اور عیاشی کی خواہش اپنا غل مچانا شروع کر دے اور اسے نچلا نہ بیٹھنے دے۔ ظاہر ہے اگر ان خواہشات کا شور زیادہ ہوگا، اس قسم کی ہوس بازی کی خواہش اگر شدید ہو تو آدمی کی عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں: ہوس بازی عقل کی دشمن ہے۔ تکبر اور خود پسندی کے بارے میں امام علیؑ فرماتے ہیں:

عجب المرء بنفسه احد مساد عقله

خود پسندی انسان کی عقل کی دشمن ہے

لالچ کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ عموماً عقل وہاں ماری جاتی ہے جہاں لالچ کی بجلی کوندتی ہے۔

رسول اکرمؐ فرماتے ہیں:

اعدیٰ عدوک نفسک التی بین جنبیک

تمہارے بدترین دشمن وہ سرکش جذبات ہیں جو خود تمہارے سینہ میں موجزن ہیں۔

ان کے بدترین دشمن ہونے کی وجہ ظاہر ہے۔ یہ عقل کے دشمن ہیں جو انسان کی بہترین دوست ہے۔ خود رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے: آدمی کی عقل اس کی بہترین دوست ہے۔ ہر دشمن کا مقابلہ عقل کی مدد سے کیا جا سکتا ہے لیکن جو دشمن عقل ہی سلب کر لے وہ خطرناک ترین دشمن ہے۔

صائب تبریزی کا ایک شعر ہے جو گویا مذکورہ بالا حدیث نبوی کا ترجمہ ہے

بستر راحت چه اندازیم بهرِ خواب خوش
ماکه چوں دل دشمنے داریم در پهلویِ خویش

ہم کس طرح چین کی نیند سو سکتے ہیں جبکہ ہمارے پہلو میں دل جیسا دشمن موجود ہے۔

اس لیے اس مضمون پر پوری توجہ دینا ضروری ہے کہ انسان کے حالات اور اس کی اندرونی قوتیں ایک دوسرے کا اثر زائل کرتی رہتی ہے۔ بالفاظ دیگر ایک دوسرے سے دشمنی اور حسد رکھتی ہیں۔ عقل کے ساتھ ہوا و ہوس کی دشمنی بھی اسی مضمون میں آتی ہیں۔

یہیں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ کس طرح تقویٰ عقل کو تقویت دیتا ہے اور بصیرت اور روشن ضمیری میں اضافہ کا باعث بنتا ہے۔ تقویٰ نہ ریتی ہے اور نہ چراغ کا تیل چونکہ وہ عقل کے دشمن کا دشمن ہے۔ اس لیے عقل کا دوست ہے۔ ہم نے ابھی کہا تھا کہ حضرت امیر المومنینؑ نے دوستوں کی تین قسمیں بتلائی ہیں جن میں سے ایک ہے "وعدوّ عدوّک"، جب تقویٰ کا ملکہ پیدا ہوجاتا ہے تو وہ ہوس کو جو عقل کی دشمن ہے، قابو میں کرلیتا ہے، پھر ہوس کی یہ مجال نہیں ہوتی کہ وہ عقل کو بیکار کرسکے یا اس کے راستے میں روڑے اٹکا سکے۔ مولانا روم نے کیا خوب کہا ہے:

چونکہ تقویٰ بست دودستِ ھوا
حق گشاید ھر دو دست را
جب تقویٰ ہوس کے ہاتھ باندھ دیتا ہے
حق تعالیٰ عقل کے ہاتھ کھول دیتا ہے

ان باتوں سے یہ ثابت ہوگیا کہ تقویٰ واقعی انسان کے طرزِ فکر اور قوت فیصلہ پر اثر انداز ہوتا ہے لیکن اس کے اثر کی نوعیت یہ ہے کہ وہ دشمن یعنی ہوس کے اثر کو زائل کرتا ہے اور عقل کیلئے آزادی سے اپنا کام کرنے کی راہ ہموار کرتا ہے۔ اس لیے امام علیؑ نے فرمایا ہے: **عتق من کل ملکة**

فلاسفہ اس قسم کے عوامل کو جن کا اثر بالواسطہ ہوتا ہے فاعل بالعرض کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک عوامل کی دو قسمیں ہیں جن کا اثر براہِ راست ہوا انہیں فاعل بالذات کہا جاتا ہے اور جن کا اثر بالواسطہ ہوا انہیں فاعل بالعرض۔ فاعل بالعرض کی صورت میں اصل سبب تو کچھ اور ہوتا ہے لیکن فاعل بالعرض راستے کی رکاوٹوں کو اس طرح دور کردیتا ہے کہ اصل سبب کو کام کرنے کا موقع مل جاتا ہے اس لیے آدمی بسا اوقات فاعل بالعرض کو ہی اصل سبب سمجھ لیتا ہے۔ اور کسی بات میں شک ہو تو اس میں کوئی شک نہیں کہ غصہ، شہوت رانی، لالچ، حس، ضد، تعصب، خود پسندی اور ایسے ہی دوسرے عیوب آدمی کو زندگی میں اندھا اور

بہرا بنا دیتے ہیں۔ ہوس کے سامنے آدمی اندھا اور بہرا ہوجاتا ہے۔ اس میں کیا شک ہوسکتا ہے کہ آدمی کو عموماً اپنے عیب نظر نہیں آتے وہ دوسروں ہی کے عیب دیکھتا ہے چاہے وہ خود دوسروں سے زیادہ عیوب میں مبتلا ہو۔ اپنے عیب نظر نہ آنے کا سبب خود پسندی اور مغروری کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے؟ کیا اس میں بھی کوئی شک ہے کہ اہل تقویٰ اپنے اخلاقی مجاہدات کے سبب خود پسندی، لالچ اور دوسرے نفسانی رذائل پر غالب آجاتے ہیں۔ انہیں اپنے عیوب کا بہتر احساس اور ادراک ہوتا ہے۔ کیا انسان کیلئے اس سے بہتر اور مفید تر بھی کوئی علم و شعور ہوسکتا ہے کہ اسے اپنی ذات کا علم ہو۔ وہ اپنے عیبوں سے واقف ہو اور اسے یہ معلوم ہو کہ وہ اپنی اصلاح کرسکتا ہے؟

اگر خدا ہمیں یہ توفیق دے کہ ہم تقویٰ کی طاقت سے اپنے نفس امارہ کو زیر کرسکیں تو اس وقت ہم دیکھیں گے کہ کس طرح ہماری آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ سعادت ابدی حاصل کرنے کا راستہ کیسا صاف نظر آنے لگتا ہے اور ہماری عقل کتنی اچھی طرح ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ اس وقت ہم سمجھیں گے کہ یہ مسائل کچھ ایسے پیچیدہ اور دلائل کے محتاج نہیں تھے۔ ہر بات واضح اور روشن تھی۔ صرف ہوا و ہوس کے شور و شغب میں ہم عقل کی بات پر کان نہیں دھر رہے تھے۔

کیا ہوش اور عقل میں کچھ فرق ہے؟

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض لوگ علمی مسائل کو سمجھنے میں بہت ہوشیار اور دوسروں سے بہت آگے ہوتے ہیں لیکن یہی لوگ زندگی کے مسائل کو سمجھنے اور زندگی میں اپنی راہ متعین کرنے کے معاملہ میں پھسڈّی ثابت ہوتے ہیں۔ یہاں ان کی سمجھ کام نہیں کرتی۔ بہت سے لوگ جو علمی لحاظ سے ان سے بہت پیچھے ہیں، اپنی زندگی کی مصلحتوں کو ان سے بہتر سمجھتے ہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان میں دو چیزیں ہیں ایک ہوش، دوسری عقل، بعض لوگ زیادہ ہوشیار ہیں اور بعض دوسرے سے زیادہ عقلمند؟ حقیقت یہ ہے کہ ہم دو ایسی قوتیں نہیں جن میں سے ایک کا نام عقل ہو اور دوسری کا ہوش۔ رہی یہ بات کہ کچھ ہوشمند لوگ عملی مسائل میں پریشان ہوجاتے ہیں اور ان کی سمجھ کام نہیں کرتی، اس کی وجہ وہی ہے کہ دشمنان عقل کی شورش سے ان کی عقل ناکارہ ہوجاتی ہے اور وہ عقل کی بات پر کان نہیں دھرتے۔ دراصل اس قسم کے لوگوں میں یہ شورش زیادہ ہوتی ہے مگر یہ بات نہیں کہ ان کی عقل میں کچھ کمی ہو۔

میں نے شروع میں اشارتاً کہا تھا کہ جہاں تک عقل نظری کا تعلق ہے تقویٰ روح کی پاکیزگی اور مجاہدۂ اخلاقی وغیرہ کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا حتیٰ کہ فلسفۂ الٰہی کا بھی ان باتوں سے کوئی تعلق نہیں۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ اس کے برخلاف معرفتِ الٰہی کے حصول میں تقویٰ اور مجاہدہ کی تاثیر مسلّم ہے۔ یہ مضمون مستقل بحث کا محتاج ہے۔ میں نے مختصر طور پر صرف اجمالی اشارے کیے ہیں۔

زمانۂ قدیم میں بہت سے عقلاء کا یہ خیال رہا ہے کہ انسان میں عقل وادراک کی دوسری قوتوں کے علاوہ ایک اور پراسرار حس موجود ہے جس کو حسِ الہام گیری کہا جاسکتا ہے۔ عصرِ حاضر کی تحقیق بھی اس نظریہ کی تائید کرتی ہے۔ اس کے مطابق انسان میں ایک ایسی حقیقی حس موجود ہے جو دوسرے تمام حواس اور قوتوں سے ممتاز ہے۔ یہ حس تمام افراد میں کمی بیشی اور قوت وضعف کے فرق کے ساتھ موجود ہے۔ تربیت اور مشق کے ذریعہ سے اس حس کو بڑھایا بھی جاسکتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا وہ چیز ہے جو اس حس کی پرورش ونشوونما اور تقویت کا سبب بنتی ہے۔

جو باتیں اس حس کی نشوونما اور تقویت کا سبب بنتی ہیں وہ ہیں تقویٰ، طہارت، اخلاقی مجاہدہ اور نفسانی خواہشات کے خلاف جہاد۔ دینی تعلیمات کے مطابق بھی یہ ایک مسلمہ اور ناقابل انکار حقیقت ہے۔ میں اس ضمن میں یہاں صرف چند جملے نہج البلاغہ سے نقل کرتا ہوں۔

حضرت امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں:

اس نے اپنی عقل کو زندہ کرلیا اور اپنے نفسِ امارہ کو کچل دیا۔ اس مجاہدہ کا اثر اس کے بدن پر بھی نظر آنے لگا۔ اس کی موٹی ہڈیاں نازک ہوگئیں اور اس کے وجود میں ایک لطافت پیدا ہوگئی۔ اس وقت ایک تیز روشنی چمکی جس نے اس کی راہ میں روشنی کردی چنانچہ وہ صحیح راستہ پر چل پڑا اور سلامتی کے دروازے تک پہنچ گیا۔

يَهْدِىْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

جو اللہ کی رضا حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اللہ اس کے ذریعے ان کی سلامتی کے راستوں کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ انہیں اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لے آتا ہے اور انہیں سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔ (سورہ مائدہ۔ آیت ۱۶)

تقویٰ اور پاکیزگیٔ احساسات:

تقویٰ اور طہارت ایک اور سمت سے بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ سمت احساسات وجذبات کی ہے۔ تقویٰ سے احساسات زیادہ نازک اور لطیف ہوجاتے ہیں۔ یہ بات نہیں کہ صاحب تقویٰ جو اپنے آپ کو گندے اور برے کاموں سے باز رکھتا ہے اور ایسی برائیوں سے بچتا ہے جیسے ریاکاری، خوشامد اور کاسہ لیسی، اپنے ضمیر کو پاک وصاف رکھتا اور اپنی عزت نفس کو برقرار رکھتا ہے اور اس کی توجہ مادی امور سے زیادہ روحانی امور کی طرف مبذول رہتی ہے، اس کے احساسات وجذبات اس شخص کے سے ہوں جو گناہوں اور گندے کاموں میں غرق اور عیش پرستی میں منہمک ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ صاحب تقویٰ کے جذبات زیادہ بلند، زیادہ نازک اور زیادہ پاکیزہ ہوں گے، وہ روحانی حسن سے زیادہ متاثر ہوگا۔ وہ دنیا کو کسی اور ہی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اسے کچھ اور ہی جلوہ نظر آتا ہے۔ جو عقلی اور ذہنی حسن وجمال دنیا میں موجود ہے وہ اپنے لطیف احساس کی بدولت اسے بہتر طور پر محسوس ہوتا ہے۔

کبھی کبھی یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ اب کیوں پہلے جیسے شعراء پیدا نہیں ہوتے؟ جو لطیف اور شگفتگی مثلاً سعدی اور حافظ کے کلام میں ہے اور وہ آج کل کے شعراء کے کلام میں کیوں نہیں؟ حالانکہ ہر چیز نے ترقی کی ہے، علم میں پیشرفت اور خیالات میں بالیدگی آئی ہے اور ہر لحاظ سے دنیا کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے۔

معاصر شعراء مانیں یا نہ مانیں میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اچھے شعر کیلئے فطری ذوق اور تخلیقی قوت کے علاوہ ضمیر کی شگفتگی، لطافت اور اثر پذیری بھی ضروری ہے اور یہ شگفتگی اور لطافت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب شاعر میں تقویٰ اور روحانیت بھی ہو، وہ غیظ وغضب اور شہوت کا بندہ نہ ہو۔ اس کے مزاج میں آزادی اور وارستگی ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض لوگ یہ کہیں کہ گزشتہ زمانے کے شعراء تو خود اپنی گناہوں میں آلودگی کا اعتراف کرتے ہیں۔ ہے تو یہ عجیب معماً لیکن میرا ذاتی خیال یہی ہے کہ کوئی بداعمال شخص ذہنی اور روحانی لطافتوں کا صحیح ادراک نہیں کرسکتا اور نہ ایسے شگفتہ ودل پسند مضامین تخلیق کرسکتا ہے جو بعض شعراء کے کلام میں دیکھنے میں آتے ہیں۔

تقویٰ اور مشکلات پر قابو پانے کی طاقت:

تقویٰ کے ایک اور اثر کے بارے میں قرآن کریم میں ہے:

وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا (الطلاق: ۲)

یعنی جسے تقوائے الٰہی حاصل ہوگا اللہ اس کیلئے مشکلات سے نکلنے کا کوئی راستہ پیدا کردے گا۔

ایک اور آیت میں ہے:

وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَهُ مِنْ أَمْرِهِ يُسْرًا (الطلاق: ۴)

جسے تقوائے الٰہی حاصل ہوگا اللہ اس کے کاموں میں ایک طرح کی آسانی پیدا کردے گا۔

امیر المومنینؑ فرماتے ہیں:

"جس نے تقویٰ اختیار کیا اس پر مصیبتیں آتی ہیں لیکن ٹل جاتی ہیں اور تلخیاں شیریں ہوجاتی ہیں، موجیں چڑھ کر آتی ہیں لیکن پرے ہٹ جاتی ہیں۔ صعوبتیں برستی ہیں لیکن چھٹ جاتی ہیں"۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ تقویٰ تو ایک روحانی اور اخلاقی معاملہ ہے اس کا مصائب ومشکلات پر قابو پانے سے کیا تعلق!

مشکلات کی دو قسمیں:

یہاں ایک تمہید عرض کرتا ہوں مصائب وشدائد جو انسان کو پیش آتے ہیں اور جن مشکلات میں انسان گرفتار ہوتا ہے ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ مشکلات ہیں جن میں انسان کے اپنے ارادہ اور اختیار کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ مثلاً آدمی ہوائی جہاز پر سوار ہو اور جہاز خراب ہوجائے یا کشتی پر سوار ہو اور کشتی طوفان میں گھر جائے اور ڈوبنے کا خطرہ پیدا ہوجائے۔ اس قسم کی مصیبت ہر شخص پر آسکتی ہے۔ اس کا پہلے سے کوئی علم نہیں ہوتا اور نہ انسان کے اپنے ارادہ واختیار کو اس میں کوئی دخل ہے۔

مصائب کی دوسری قسم وہ ہے جس میں انسان کے اپنے ارادہ کو دخل ہے اور وہ چاہے تو ان مصائب

میں گرفتار ہو اور نہ چاہے تو نہ ہو اور اگر ان مصائب میں مبتلاء بھی ہوجائے تو وہ اپنے ارادہ سے ان سے نکل سکتا ہے۔ یہ اخلاقی واجتماعی مصائب ہیں۔

اب یہاں دو سوال پیش آتے ہیں۔ پہلا سوال تو یہ ہے کہ پہلی قسم کے مصائب کی صورت میں تقویٰ کا کیا اثر ہوتا ہے۔ اور دوسرا یہی سوال دوسری قسم کے مصائب کے متعلق ہے۔

پہلی قسم کے متعلق تو میں اس وقت کچھ نہیں کہہ سکتا کہ قرآنی آیات کا اطلاق اس قسم کے مصائب پر بھی ہے یا نہیں لیکن ہوسکتا ہے کہ اس طرح کا کوئی روحانی آئین اور اس قسم کی ضمانت الٰہی موجود ہو۔ اس کی مثال ایسی ہی ہوگی جیسی قبولیت دعا کی۔ البتہ نہج البلاغہ میں ایک فقرہ ہے جس کا مطلب یہ لیا جاسکتا ہے کہ قرآنی آیات میں مصائب وشدائد سے نجات سے مراد دوسری قسم کے مصائب اور تکالیف ہی ہیں۔ جناب امیر المومنینؑ خطبہ نمبر ۱۸۱ میں فرماتے ہیں:

و اعلموا انه من يتق الله يجعل له مخرجاً من الفتن و نوراً من الظلم

یہ سمجھ لو کہ جو شخص تقوائے الٰہی اختیار کرتا ہے اللہ اسے فتنوں سے نکلنے اور تاریکیوں سے روشنی میں آنے کا کوئی نہ کوئی راستہ سمجھا دیتا ہے۔

پہلی قسم کی مشکلات بہت کم پیش آتی ہیں۔ زیادہ تر مشکلات جو انسان کو پیش آتی ہیں وہ اس کی زندگی کو تلخ اور مکدر کردیتی ہیں اور دنیا وآخرت کی ہر سعادت سے اسے محروم کردیتی ہیں۔ وہ اخلاقی اور معاشرتی فتنے اور مصیبتیں ہی ہوتی ہیں۔ اس بات کے پیش نظر کہ خود انسان ہی اپنی زیادہ تر مشکلات کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ آدمی خود ہی اپنا سب سے بڑا دشمن ہے۔

اعدیٰ عدوک نفسک التی بین جنبیک

ہر شخص اپنی تقدیر کا فیصلہ خود کرتا ہے لیکن عموماً اس کا رویہ اس کے ساتھ معاندانہ ہی ہوتا ہے۔

دشمن بد شمن آن نه پندو که بے خرد

بانفسِ خود کند بمراد هوای خویش

کوئی دشمن بھی دشمن کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرتا جو بے عقل خود اپنے ساتھ ہوا وہوس کے چکر میں پڑ کر کرتا ہے

ہماری زیادہ تر مشکلات باہر سے نہیں آتیں، خود ہم اپنے ہی ہاتھوں اپنے لیے مشکلات پیدا کرتے

ہیں۔ میں نے خود اپنی زندگی میں اور دوسروں کی زندگی میں بھی جن کو میں نے قریب سے دیکھا ہے یہی تجربہ کیا ہے۔ میں نے دیکھا کہ واقعی یہی بات ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ تقویٰ کا ہتھیار کتنا موثر ہے۔ تقویٰ انسان کو فتنوں سے دور رکھتا ہے اور بالفرض اگر کوئی کسی مشکل میں گرفتار بھی ہوجائے تو یہ اسے اس مشکل سے نجات دلاتا دیتا ہے۔ قرآن کریم کی سورہ اعراف آیت ۲۰۱ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُمْ مُبْصِرُونَ (اعراف۔ ۲۰۱)

اہل تقویٰ کا تو یہ حال ہے کہ اگر شیطان کے اثر سے بھی کوئی برا خیال انہیں چھو بھی جاتا ہے تو وہ چوکنے ہوجاتے ہیں ور پھر انہیں صاف نظر آنے لگتا ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تقویٰ کے پہلے اثر یعنی روشن ضمیری اور ان یا دبصیرت کے ساتھ ساتھ دوسرا اثر یہ ہوتا ہے کہ ان کو ان مشکلات اور تکالیف سے نجات مل جاتی ہے جو گناہ کی تاریکی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ معاصی اور ہوا و ہوس کے سیاہ بادل چھٹ جاتے ہیں اور تقویٰ کی روشنی میں راستہ صاف دکھائی دیتا ہے تاکہ آدمی گڑھوں اور کھائیوں سے بچ کر چلے۔ اگر اتفاق سے کہیں پھنس بھی جائے تو تقویٰ کی روشنی میں باہر نکلنے کا راستہ مل جاتا ہے۔

علاوہ ازیں تقویٰ اور احتیاط کے سبب آدمی اپنی اندرونی طاقتوں کے اس ذخیرہ کو جو خود اس کے اندر موجود ہے۔ لغو و حرام کاموں اور لہو و لعب میں ضائع کرنے کے بجائے اسے محفوظ رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا آدمی جو باہمت ہو اپنی مرضی کا مالک ہو اور جس کی شخصیت مکمل ہو، بہتر فیصلے کرسکتا ہے اور اپنی نجات کی راہ تلاش کرسکتا ہے۔ جس طرح روشنی نجات کا ذریعہ ہے اسی طرح ہمت و ارادہ بھی ایسا وسیلہ ہے جو خداوند تعالیٰ نے آدمی کو دیا ہے۔

سورہ یوسف کے اواخر میں ایک آیت ہے جسے اس عجیب اور ولولہ انگیز داستان کا اخلاقی نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ حضرت یوسفؑ کا قصہ تو کم و بیش سب ہی نے سنا ہے۔ جب یہ قصہ اختتام کو پہنچنے والا ہوتا ہے یعنی حضرت یوسفؑ عزیز مصر بن جاتے ہیں اور برادران یوسفؑ ایک قحط کے سبب غلہ حاصل کرنے کیلئے کنعان سے مصر آتے ہیں۔، وہ یوسفؑ کو نہیں پہنچانتے مگر یوسفؑ انہیں پہچان لیتے ہیں اور ایک بہانہ

سے اپنے سگے بھائی بنیامین کو اپنے پاس روک لیتے ہیں۔ اس وقت برادران یوسفؑ دوبارہ آتے ہیں اور بڑی عاجزی سے یوسفؑ سے غلہ کی درخواست کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس تذلل و زاری کا نقشہ اس آیت میں کھینچا ہے:

اے سردار!: ہم اور ہمارے اہل و عیال سخت مصیبت میں مبتلا ہیں اور ہم کچھ حقیر سی پونجی لے کر آئے ہیں۔ آپ ہمیں پورا غلہ عنایت فرمائیں اور ہم کو خیرات دیں۔ اللہ خیرات دینے والوں کو جزائے خیر دیتا ہے۔

اب تک یوسفؑ نے اپنا تعارف نہیں کرایا تھا۔ اب انہوں نے چاہا کہ اپنا تعارف کرادیں۔

تب انہوں نے کہا:

"تمہیں یاد ہے از روئے نادانی و جہالت تم نے یوسفؑ کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا"

اس پر وہ چونکے اور کہنے لگے:

"ہائیں، کیا تم ہی یوسف ہو؟"

فرمایا: ہاں میں یوسفؑ ہوں اور یہ میرا بھائی ہے اور اللہ نے ہم پر بڑا احسان فرمایا ہے۔

إِنَّهُ مَنْ يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ (یوسف:90)

اگر کوئی تقویٰ اور صبر سے کام لے تو ایسے لوگوں کا اجر اللہ کے یہاں ضائع نہیں جاتا۔

یہ جو کچھ تم دیکھ رہے ہو یہ نتیجہ ہے تقویٰ، پاکپازی کا اور اپنے نفس کو قابو میں رکھنے کا۔ میں غلام بنا، ہر کس و ناکس کا محکوم ہوا مگر میں نے تقویٰ کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ مصر کی سر برآوردہ ترین اور حسین ترین عورت نے مجھ جیسے حقیر فقیر سے اپنی خواہش پوری کرنے کی درخواست کی لیکن میں اپنے تقویٰ پر قائم رہا۔ میں نے کہا: بارالہا! مجھے قید خانہ زیادہ پسند ہے بہ نسبت اس کام کے جو یہ لوگ مجھ سے چاہتے ہیں۔ اس دن کے تقویٰ نے مجھے آج عزیز مصر بنا دیا۔ تقویٰ اور صبر، پاکبازی اور پاکدامنی کبھی اس دنیا میں رائیگاں نہیں جاتی۔ تقویٰ آدمی کو قصر مذلت سے نکال کر اوج عزت پر پہنچاتا ہے۔

إِنَّهُ مَنْ يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے قصہ یوسفؑ کے اخلاقی نتیجہ کا خلاصہ اس آیت میں بیان کردیا ہے کہ بالآخر تقویٰ ہی کامیاب ہوتا ہے۔ تقویٰ آدمی کو بہت سے مصائب اور مشکلات سے نجات دلاتا

ہے اوراوجِ عزت پر پہنچا دیتا ہے۔

وَمَنْ یَتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَہٗ مَخْرَجًا (الطلاق : ۲)

جو صاحبانِ تقویٰ ہر حال میں اپنا دامن بچائے رکھتے ہیں ان کیلئے ناکامی اور بے بسی کا کوئی وجود ہی نہیں۔

جب آدمی حضرت امام حسینؑ کے وہ اقوال اور خطبات دیکھتا ہے جو آپ نے اپنے خاندانِ محترم کے سامنے دیے تو انگشت بدندان رہ جاتا ہے کہ کس اعتماد و یقین کے ساتھ آپ انہیں اطمینان دلا رہے تھے۔

اللہ اللہ! کیا جذبہ اور کیا ایمان تھا۔ خدایا! یہ یقین انہیں کہاں سے حاصل ہوا تھا۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ جب وہ دوسری بار اپنے اہلِ بیتؑ سے رخصت ہونے لگے تو فرمایا:

استعدّو اللبلآء و اعلموا انّ اللہ حافظکم و حامیکم

سختی برداشت کرنے کیلئے تیار رہو اور یہ سمجھ لو کہ اللہ تمہارا حافظ و مددگار ہے

و سینجیکم من شرِ الاعداء و یجعل عاقبۃ امر کم الیٰ خیر

وہ تم کو دشمنوں کے شر سے نجات دے گا اور بالآخر تمہارا انجام بخیر ہوگا

و یعذب اعادیکم با نواع البلاء و یعوضکم اللہ عن ھٰذہ البلیۃ بانواع النعم و الکرامۃ

تمہارے دشمنوں کو طرح طرح کے عذاب میں مبتلا کرے گا اور تم کو اس تکلیف کے بدلے طرح طرح کی نعمتوں سے نوازے گا۔

فلا تشکوا و لا تقولوا بالسنتکم ما ینقص من قدر کم

لہٰذا شکایت مت کرو اور کوئی ایسی بات زبان پر مت لاؤ جو تمہارے شایانِ شان نہ ہو۔

امام حسینؑ کو جو اطمینان تھا کہ آخر میں وہی کامیاب ہونگے اور جس کی تلقین وہ اپنے اہلِ خاندان کو کر رہے تھے اس کا سرچشمہ یہی آیت تھی:

وَمَنْ یَتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَہٗ مَخْرَجًا

اُن کے پاس قرآن کی ضمانت موجود تھی اور انہیں اسی قسم کا اطمینان اور یقین حاصل تھا جیسا یوسفؑ

صدیق کو حاصل تھا۔ جب ان کے تقویٰ کا نتیجہ برآمد ہوا تو حضرت یوسفؑ نے جوشِ مسرت سے کہا تھا:

إِنَّهُ مَنْ يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ

لیکن امام حسینؑ کی نظر داستان تمام ہونے سے پہلے ہی نتیجہ پر تھی۔

امام حسینؑ کے نپے تلے جملے ان کے اہلِ خاندان کے قلب پر تیر کی طرح اپنے نشانہ پر بیٹھے۔ انہوں نے سختی اور قید کو برداشت کیا لیکن تقویٰ اور صبر کی بدولت انجام وہی ہوا جس کی پیشین گوئی امام حسینؑ نے کی تھی اور جس کی ضمانت خداوندِ کریم نے قرآن میں دی تھی۔ چند ہی روز بعد ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت زینبؑ نے امام حسینؑ کا قول بتغیر الفاظ بڑے اطمینان سے دہرایا۔ یزید بن معاویہ کو مخاطب کر کے کہا:

"تو جو چاہے تدبیر کر اور جیسی چاہے کوشش کر کے دیکھ لے تو ہمارا نام نہیں مٹا سکتا اور نہ ہماری مقبولیت اور احترام میں کمی کر سکتا ہے، نہ ہی تو اس وحی کو ختم کر سکتا ہے جو ہمارے خاندان میں زندہ ہے، تیرے لیے اس دنیا میں بجز ننگ و عار کچھ باقی نہ رہے گا۔"

سوالات

سوال ۱: تقویٰ کے دو خاص اثر کون سے ہیں؟

سوال ۲: تقویٰ اور تعلیم کا آپس میں تعلق بیان کریں؟

سوال ۳: حضرت علیؑ کے نزدیک کسی چیز کی حد سے بڑھی محبت کا کیا نقصان ہے؟

سوال ۴: فلاسفہ کے مطابق عقل کی دو قسموں کی وضاحت کریں؟

سوال ۵: روشن ضمیری میں تقویٰ کا اثر کیا ہے؟

سوال ۶: کیا ہوش اور عقل میں کچھ فرق ہے؟ وضاحت کیجئے۔

سوال ۷: شہید مطہریؒ کے مطابق اب کیوں پہلے جیسے شعراء پیدا نہیں ہوتے؟

سوال ۸: تقویٰ مشکلات پر کیسے قابو پاتا ہے؟

سوال ۹: مشکلات کی دو قسمیں کونسی ہیں؟

سوال ۱۰: تقویٰ کے بارے میں امام حسینؑ نے عاشورہ کے روز کیا فرمایا؟

سوال ۱۱: حضرت زینبؑ نے یزید بن معاویہ سے مخاطب ہو کر کیا فرمایا؟